GUMAN گمان

VOL 7, ISSUE 3, 2024

E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154

https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

Feminine Tone of Mah Para Safdar's Autobiography "Mera Zamana Meri Kahani"

ماہ پارصفدر کی خودنوشت "میرا زمانہ میری کہانی" کا نسائی لب ولہجہ

فاخرہ یاسمین

ایم فل سکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، رحیمیار خان کیمپس

ڈاکٹر محمد ریاض عابد

اسٹنٹ ہر وفیسر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، بہاولنگر کیمپس

HEC Y Catogory

Abstract

known famous newsreader, column writer and journalist. She joined PTV news as newscaster in 1977 and radio Pakistan news in 1980.In 1990, she joined BBC and served BBC Urdu service 25 years. In BBC she presented various programs as presenter and researcher. She also wrote columns for BBC Urdu website. The columns about her memories are liked by people. People considered her memories as their own memories. So, she thought to share all his memories with her fans and followers. She published her autobiography titled "Myra Zamana Meri Kahani" in 2022 by Jhelum Book Corner. Her autobiography has three parts. In first section she elaborated her childhood and college life with her family and society in 1960 -1970. In second section she presented her university life with the era of 1970 – 1980. In this section she also wrote her memories regarding political history in which she remained part and eye witness of those crucial incidents. In third section, she described her experiences as journalist in London with BBC Urdu Service. She was awarded appreciation certificate on her two series titled "Khatoon Mashriq Maghrib main and Baluchistan Series" appreciated in BBC Urdu Service.

Key words: Mahpara Safdar, autobiography, feminine view

GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

دنیائے اردو ادب میں مرد کی بالادستی روز اول سے رہی ہے. مرد لکھاریوں کی کہانیوں میں خاتون کے گرد کہانی بنی جاتی رہی مگر وہ خود کہانی کار نہ بن سکی. شاعری میں خواتین موضوع تغزل تو رہیں مگر کبھی غزل کہہ نہ سکیں. سماج اور لکھاریوں نے اسے خاتون خانہ ٹھہرا کر اسکی فہم و فراست اور عقل و شعور کو تسلیم کرنے سے انکار کیا. یہ انکار کسی ایک سماج کی منظر نہ تھا بلکہ قدیم تہذیبوں میں بھی اسے تشخص نہ مل سکا. ہر دور میں محکومی اور مظلومی صنف نازک کے حصے میں آتی رہی۔ تہذیب و تمدن اور علم و آگہی کا قدیم گہوارہ یونان بھی عورت کو ادنی درجہ مخلوق قرار دیتا تھا۔ یونان کے مشہور فلسفی سقراط نے عورت کو فتنہ و فساد کی چیز قرار دیا. یونان کے بعد رومی تہذیب علم و فن کا گہوارہ رہی مگر صنف نازک یہاں بھی اپنی شناخت کی تلاش میں رہی۔ رومی تہذیب میں بھی عورت اپنے جائز حقوق سے محروم رہی۔ عورت نہ قانونی حق مانگ سکتی تھی اور نہ ہی گواہی دے سکتی تھی۔ بوقت ضرورت باپ انی بیٹوں کو فروخت کرتے تھے۔ شبنم شکیل لکھتی ہیں. "دنیا کی ہر تہذیب نے عورت کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا. شاید اسکی انفرادی سوچ اور صلاحیت سے خوف کھا کر معاشرے نے اسے رفتہ رفتہ پس منظر کے دھندلکوں میں دھکیل دیا...غالبا اس لیے ورجینا وولف سوال کرتی ہیں کہ اگر شکسپیئر کی بہن اس جیسی صلاحیت کی مالک ہوتی تو معاشرہ اسکے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا." [1]

غدر کے بعد اردو ادب میں خاتون خانہ نے نثر و شاعری میں قلم ازمائی کی. خواتین لکھاریوں کو کوئی بھی ادبی راستہ ہموار نہ ملا-دو چار شاعرات نے اشعار کہے بھی تو قلمی نام یا مذکر جنس کا سہارا لے کر اپنی شناخت کو پس پردہ رکھا. خواتین ادب کی ہر صنف کی اولین لکھاری خاتون نے سماجی نشتر کھائے مگر قلم ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔ ایسے محبوس ماحول میں خواتین کی آپ بیتیاں سامنے آنا اچھنبے کی بات ہے کہ خواتین نے روداد حیات کو قلمبند کیا اور رنج و الم کی نوحہ گری کے ساتھ سماجی ناانصافیوں و نایمواریوں کا عندیہ دیا. گردش دوراں میں شعوری بالادستی سے خواتین نے آپ بیتیوں میں بے باکی کا مظاہرہ کیا. شاعری میں شاعرات نے نسائی تخلص برتے اور اپنے نام سے اپنا تشخص قائم کیا۔ بیسویں صدی میں تقسیم بر صغیر کے بعد نثر اور شاعری میں نسائی حسیت کی بازگشت سامنے آئی۔ شاعرات میں فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، شعری اور ادا جعفری نے نسائی حسیت کی ترجمانی کی. جبکہ نثر میں رشیدہ جہاں، کشور ناہید، عصمت چغتائی، ادا جعفری اور حمیدہ سالم قابل تقلید نام ہیں۔ خود نوشت میں نسائی رنج والم کی یاد و فریاد کے ساتھ نسائی حسیت اور نسائی تشخص کی جنگ بیسویں صدی کی خود نوشتوں کی خصوصیت ہے۔ خالدہ پروین لکھتی ہیں:-

"نسائی حسیت صرف یہی نہیں کہ مؤنث واحد متکلم کا صیغہ اپنا لیا جائے۔ گھر، آنگن اور سنگھار کی بات کی جائے. نسائی حسیت سے مراد ہے کہ عورت جس طرح زندگی کو دیکھتی اور بسر کرتی ہے وہ مرد سے مختلف ہے" [2]

نسائی حسیت کے دو بنیادی عناصر حسیت اور تانیثیت ہے. حسیت سے مراد جزباتی حسیت اور تانیثیت سے مراد فکری شعوری حسیت ہے. اردو ادب کے تمام خواتین لکھاریوں کی صدائے احتجاج حسیت سے بلند ہو کر تانیثیت پر ٹھہری. حضرات و سماج کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں نے خواتین کو تانیثیت کا شعور دیا کہ نسائی احساس کی بازگشت نسائی تشخص کا مطالبہ بنی. اج اقوام عالم میں صنف نازک اپنے تشخص کے لیے سراپا احتجاج ہے. اسلام نے پہلے ہی خواتین کو انکے حقوق دے کر اس کی عزت و ناموس کو برتر کر دیا تھا مگر دیگر مذاہب کی خواتین اسکی جستجو میں تھیں. مغرب سے شروع ہونے والی تحریک تانیثیت اس سماج کی عکاس تھی. ماہ پارہ صفدر نے بھی اپنی آپ بیتی میں نسائی حسیت کا مظاہرہ کیا ہے. مصنفہ بہنوں میں چوتھے نمبر پر ہیں اور ان سے دو چھوٹی بہنیں ہیں. علمی، ادبی اور وضع دار گھرانے سے ہونے کے باوجود چوتھی بیٹی کی پیدائش سے گھر کا ماحول افسردہ تھا۔ مصنفہ کی پانچویں بہن کی

GUMAN
گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

پیدائش خوشاب میں ہوئی۔ان کی والدہ کی دوست خیریت معلوم کرنے اور نومولود کو دیکھنے کے بعد بولی کی اس بیٹی کا نام اللہ معافی رکھو تاکہ اللہ تمہیں بیٹیوں سے معاف کرے۔ مصنفہ کی چھٹی بہن کی ولادت پر گھر کا ماحول تو بوجھل تھا۔والدین کی فطری خواہش تو بیٹے کی تھی۔ مگر ایسی بھی ذہنی پسماندگی نہ تھی کہ بیٹی کی ولادت پر افسوس کا اظہار کرتے۔وہ لکھتی ہیں۔:

"امی کی ایک دوست جن کا تعلق سرگودھا کے قریبی گاؤں جلال پور جٹاں سے تھا۔ ہمارے گھر آئی اور نومولود بچی کے جھولے کے پاس بیٹھ کر ہاتھ ملنے شروع کر دیئے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر باقاعدہ اظہار افسوس کرنے لگیں۔"3

لوگ بیٹی کی پیدائش پر ٹھنڈی آہ بھر کر یہ جملہ کہتے ہیں کہ "بیٹیاں بری نہیں بس ان کے نصیب اچھے ہوں۔" یہ جملہ بیٹی کی ماں کے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔خود نوشت نگار کو اپنی والدہ کا کرب یاد آتا ہے جنہوں نے نہ جانے کتنی بار ایسے فقرے سنے ہوں گے۔وہ لکھتی ہیں.

"سماجی رویوں کے برعکس میری ماں نے بیٹے کے نہ ہونے کو کبھی اپنی محرومی سمجھا ہی نہیں۔انھوں نے کبھی بیٹیوں کو بوجھ نہیں جانا۔"4

چھ ذہین اور بلند کردار بیٹیوں کا گھرانہ چھ آوارہ لڑکوں کے گھرانے پر فوقیت نہیں رکھتا تھا۔کیسا سماجی تضاد اور منافقت تھی۔وہ سماجی سوچ کی خوبصورت عکاسی کرتی ہیں۔:

"ہمارا بھائی نہ ہونا کوئی بہت "بڑا المیہ ہو جیسے وہ ہم پر ترس کھا رہے ہوں۔اس شودی دا کوئی بھرا نہیں۔ایسے بے رحم معاشرے میں رہنا باوجود جس میں بیٹا نہ ہونا بڑی محرومی کی بات سمجھی جاتی تھی۔جہاں مرے باپ کی شناخت یہ تھی کہ بیٹیوں والے زیدی صاحب کہا جاتا تھا۔"5

زمانہ جاہلیت میں صنف نازک کو زندہ درگور کرنے کی وجہ عورتوں کا مال غنیمت میں جانا اور تقسیم تھی۔عورت بطور ہتھیار جدید دور میں بھی استعمال ہو رہی ہے۔عالمی جنگوں میں کوریائی عورتوں کا برسوں جنسی غلامی میں رہنا اور سابق مشرقی پاکستان میں بھی عورتوں کی عصمت دری اسکی واضح مثالیں ہیں۔ قبل از اسلام بیٹی کی پیدائش پر صنف مخالف کے رویے جو اکیسویں صدی میں بھی عمومی سطح پر ناپید نظر آتے ہیں۔آج لڑکیوں کو زندہ دفن تو نہیں کیا جاتا مگر انھیں بے وقعت بنا کر معاشرے میں زندہ لاش بنا دیا جاتا ہے۔مصنفہ لڑکیوں کو معاشرے پر بوجھ بنانے کی بجائے ان کے فعال کردار کی ترغیب دیتی ہیں۔

برصغیر میں تعلیم نسواں غیر ضروری سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم نسواں کا معیار صرف اچھے رشتوں تک محدود تھا۔دوران تعلیم شادی اس زمانے میں معمولی بات تھی۔ گورا رنگ اس زمانے سے آج تک خوبصورتی کا معیار ٹھہرا مگر تعلمی رجحان میں بڑھوتری سے جلد شادی کا معیار بدل گیا ہے۔اس زمانے میں لڑکیوں کی جلد شادی ان کی اچھائی اور خوش شکل ہونے سے تعبیر کی جاتی تھی۔ سن ستر کی دہائی میں لڑکیوں کی ملازمت کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا۔لڑکیوں کے لیے صرف معلم یا ڈاکٹر کا پیشہ قابل احترام سمجھا جاتا تھا. باقی شعبہ جات کے دروازے صنف نازک کے لیے کھلے نہ تھے. مصنفہ کو بھی اس ضمن میں سماجی رکاوٹیں عبور کرنا پڑی۔ان ہی سماجی رکاوٹوں کی وجہ سے مصنفہ ڈراموں میں کام نہ کر سکی۔ تعلیم شعور کا دوسرا نام ہے۔ تعلیم معاشرت میں مرد و عورت کی تخصیص کا شعور دیتی ہے بلکہ جنس کے حقوق اور آداب معاشرت بھی سکھلاتی ہے۔ ہمارے سماج میں امور کی تقسیم بلحاظ جنس بھی خواتین کو کمزور اور محکوم طبقے میں تبدیل کرنے کے ساتھ ذہنی پسماندگی کو بھی فروغ دیتی ہے۔سماج میں عورتوں کے محکوم ہونے کی تربیت گھر

GUMAN
گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

کے ماحول سے ہی ہوتی ہے۔ جن گھرانوں میں لڑکا لڑکی کی تربیت میں تخصیص کی جاتی ہے وہی تخصیص مرد و عورت کے رویوں میں عود کر جاتی ہے۔ خود نوشت نگار لکھتی ہیں

"تعلیم کے ذریعے قدیم سماجی روایات اور صنفی امتیازات ختم کرنے کے لیے سکولوں میں لڑکے لڑکیوں کے لیے یکساں نصاب تعلیم ایک بہترین حکمت عملی ہے"6۔

والدین کے گھر سے لڑکی کو بچپن سے شادی اور سسرال کی خدمت کے لیے تیار کیا جاتا ہے جو اسے کمتر محکوم مخلوق کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ صنف نازک کی پسندیدگی کے عمل میں لڑکی کی حیثیت اک شے یا جانور سی ہو جاتی ہے۔ فرق صرف جگہ کا رہ جاتا ھے کہ منڈی کی بجائے یہی عمل چار دیواری میں ھوتا ہے۔ اک مجہول شے کی حیثیت سے صنف نازک کو کسی بھی اندھے کنویں میں دھکیل دیا جاتا ہے. شراب نوشی اور جنسی بے راہ روی نے لڑکوں کو بگاڑا تو والدین نے ان کی سدھارت شادی بیاہ میں ڈھونڈی۔ پیا کو منزل بنا کر آنے والی لڑکیوں کو سرکاری پناہ گاہوں میں امان ملی۔ کہ صنف نارک کب تلک شرابی شوہروں کی طرف سے مار کٹائی برداشت کرتیں۔ خود نوشت نگار اپنی سیریل "خاتون مشرق مغرب میں" کی تکمیل کے لیے گلاسکو سکاٹ لینڈ کے دارالامان پہنچی۔ دارالامان میں پناہ گرین اکثریت ان خواتین کی تھی جو اپنے کسی شرابی اور بگڑے کزن سے شادی کر کے دیار غیر پہنچی اور شرابی شوہروں کے تشدد اور عدم دلچسپی کے باعث سسرالی قریبی عزیزوں کے جنسی استحصال کا نشانہ بنتی ہیں. دارلامان میں پناہ گزین عورتیں اور لڑکیاں یہاں خوش تو نہ تھیں مگر وہ اپنے وطن واپس نہ جانا چاہتیں تھیں۔ وہ لکھتی ہیں۔:

"ہمارے معاشرے میں زرد سکوں کی چمک والدین کی انکھوں کو دھندلا دیتی ہے۔ بچوں کی پسند ان کا ذہنی میلان یا مزدار اجوں میں مطابقت کوئی معنی نہیں رکھتی"7۔

مرد اساس معاشرے نے خاتون کو کمزور، مجہول اور ناقص العقل مخلوق کے ساتھ حسین مجسم قرار دے کر اسے اک "شے" بنا دیا. موجود دور نے اسی حسین مجسم کو "استعمال کی شے" ٹھہرا دیا. لاہور کے شاہی محلے کے بازار حسن میں موجود لڑکیاں سماج کی بے حسی، منافقت اور ظالمانہ رویوں کی آئینہ دار تھی۔ مصنفہ نے ان عورتوں کی گفتگو سے سماج کی ایسی بھیانک تصویر پیش کی ہے جس میں مرد و عورت کی بے حسی عیاں ہے۔ ملازمت کی تلاش میں فیصل آباد کی دو لڑکیاں بازار حسن پہنچ کر اپنی اور اپنے اہلخانہ کی کفالت کر رہی تھی۔ کتنا بے جس معاشرہ ہے کہ گھریلو ملازمت کرنے والی ان عورتوں کو مردوں کی طرف سے عصمت دری کا خدشہ اور عورتوں کو اپنے مردوں کی حفاظت کا ڈر گویا ہر مجبور عورت ایک جسم ہے۔ جسے مرد جابجا جنسی تسکین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جو عورتوں اس جنسی دلدل سے نکلنا چاہتی ہیں سماج کے دروزے بھی انھیں بند ملتے ہیں گویا لاچاری، کسمپرسی، بیماری میں زندگی گزارنے والی یہ خواتین کسی مسیحا کی منتظر ہیں۔ اٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ کا زلزلہ بھی ایسے بہت سے سہارے چھین کر خواتین کو بے سہارا کر گیا۔ متعدد لاوارث بچیوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر سماج اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو رہا تھا۔ ایسی لڑکیوں کی بھی شادی کی جا رہی تھی جن کے والدین کے پاس سرے سے کوئی ٹھکانہ نہ تھا. وہ لکھتی ہیں۔:

"اپنے قیام کے دوران میں نے زلزلے سے متاثرہ بے سہارا نوجوان بچیوں کو جب دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے دیکھا تو اپنے اندر تشویش کی ایک لہر کو محسوس کیا کہ ان حالات میں خصوصا بے سہارا عورتوں اور بچیوں کے سماجی اور جنسی استحصال کے امکانات کتنے زیادہ ہیں۔"8

GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

ذات بات برادری کی زنجیروں میں بندھے سماج میں سید گھرانوں کی بچیوں کی شادی بھی ایک مسئلہ رہا ہے۔ سید گھرانوں میں کتنی بچیاں سید گھرانے میں ہی رشتہ نہ ہونے کے سبب اپنے والدین کے گھروں میں ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ مصنفہ کی بہن زریں کی شادی غیر سید گھرانے میں ہوئی۔ اس شادی کو رکوانے کی غرض سے اہل تشیع علمائے کرام سے اسے ناجائز قرار دیا۔ مزید برآں سر گودھا کے نکاح خوانوں کا نکاح خوانی سے انکار بھی جہالت کو آشکار کرتا ہے. ہمارے سماج میں جہیز کی فرسودہ رسم بیٹیوں کی بروقت رخصتی نہ ہونے کا اک محرک ہے۔ اس فرسودہ روایت کی بھینٹ میں نہ جانے کتنی بہوئیں چولہا پھٹنے جیسے واقعات کی زد میں آتی ہیں۔ بلوچستان سرداری نظام اور جرگہ شاہی کے لیے مشہور ہے۔ ماہ پارہ اکبر بگٹی سے انٹرویو کے لے بلوچستان گئی تو ان کے سرداری نظام میں عورت کی وقعت سامنے آگئی۔ خود نوشت نگار نے فیصلہ سازی کے عمل کو انکھوں سے دیکھا اور آج بھی ان کی روح اس منظر کو یاد کر کے افسردہ ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔:

"نواب صاحب نے مقتول بیوی کے کردار پر داغ دھبے ہونے کی تصدیق کر دی جو واجب القتل تھی۔ شوہر کو اپنی عزت کے لیے بیوی کو قتل کرنے کا سرٹیفکیٹ مل گیا تو بھلا سزا کیسی، میں سوچتی رہ گئی کہ نواب صاحب نے یہ انصاف کیا تھا یا عورت پر ہونے والے ظلم کی انتہا پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ 9"

بلوچستان اور خیبر پختون خوا میں ولور، ونی اور کارو کاری جیسی اساطیر کی بھینٹ چڑھنے والی بے قصور خواتین بھی اسی سماجی ریتوں کی عکاسی ہے. یہ اساطیر جو اسلامی شریعت میں تھی ہی نہیں مگر موجودہ دور میں جزو ایمان بن گئی۔ وہ جہیز کی فرسودہ لعنت کو ختم کرنے اور "ولور"، "ونی" اور کارو کاری کی بھینٹ چڑھ جانے والی لڑکیوں کے حق میں صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں۔ خواتین کا باشعور نہ ہونا بھی ناانصافیوں، زیادتیوں کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ سب سے بڑا جرم جہالت اور بے شعوری ہے۔ "عورتوں کی اکثریت کو یہ احساس بھی نہیں کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین میں نہیں مردوں کے بنائے ہوئے سماج میں جی رہی ہیں۔" 10

میاں بیوی اک دوجے کے خوشی و غمی میں ساتھی ہمارے سماج کا سب سے کمزور رشتہ جو تین بول سے جڑتا اور ٹوٹ جاتا ہے۔ توجہ طلب امر ہے کہ خاندانی سماج کا بنیادی رشتہ خلاف شریعت ٹوٹ جاتا ہے۔ خود نوشت نگار اس نازک رشتہ کی نزاکت کی طرف توجہ مبذول کرواتی ہیں۔ طلاق و حلالہ سماجی خاندانی مباحث ہیں۔ اس بنیادی مسئلے پر درست فیصلہ اور شریعت کے مابین اختلاف کو ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیتی ہیں۔ بھارت میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق ایک وقت میں تین مرتبہ طلاق کہنے کو غیر شرعی طریقہ قرار دیا ہے۔ مگر پاکستان میں اس مسئلہ پر تمام مکتب فکر کا جمہور نہ یو سکا. حلالہ بھی کسی عورت کے لیے کتنا تکلیف دہ عمل ہے۔ حالانکہ عورت ہی پہلے شوہر سے طلاق ملنے پر اس کے پاس واپس جانے کے لیے حلالہ کرے۔ مرد اس سب میں کس تکلیف سے گزرتا ہے؟ عورت کو بن چاہے طلاق کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور پھر حلالہ کا داغ بھی برداشت کرنا اس کا مقدر بنتا ہے۔ معاشرتی روایت میں عورت ہی بیٹی، بہن، بیوی بن کر ایسی غیر اسلامی روایات کی بھینٹ چڑھتی رہی ہیں۔ کشور ناہید لکھتی ہیں۔:

"یہ بھی عورت کا مقدر ٹھہرے کہ مذہب، تہذیب اور انسانیت کو مرد کے حق میں اور عورت کے خلاف استعمال کیا جائے۔ کبھی اس کا استحصال ہو خوبصورتی کے نام پر، کبھی ذہانت، کبھی وسائل اور کبھی غربت کے نام پر۔ خدا کی بھی شناخت کی جائے تو مرد ذات کے سے انداز میں، صلیب پر عیسی چڑھے، دم عیسی کہلائے مگر اس مریم کو صرف تصویروں میں سجایا جائے کہ جس نے جنم دیا تھا۔" 11

GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

ہمارے سماج میں ہلکے پھلکے ستائشی جملے عام ہیں۔ایسے ستائشی جملوں کی مثال اسطرح اپنے مشاہدات سے دیتی ہیں۔کسی محفل میں خاتون نے چائے بناتے ہوئے پوچھا، محترم آپ کی پیالی میں کتنی چینی ڈالوں تو جواب ملتا تھا کہ میں اب اپنی انگلی پیالی میں ہلا دیجیے چائے میٹھی ہو جائے گی۔مغرب میں خواتین ایسے ستائشی جملوں کو جنسی حملے بازی اور جنسی پیش قدمی کے مترادف قرار دیتی ہیں۔وہ صنفی استعاروں کی بھی کھلے لفظوں میں مزمت کرتی ہیں۔صنفی استعارے بھی سماجی ذہنی پسماندگی کی علامت ہیں۔"مرد کے بچے بنو، بہانے بازی چھوڑو، عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن رکھی ہیں جیسے استعارے سماجی سطح پر عورتوں پر تنقید ہے۔وہ چوڑیوں کو عورت کی کمزوری بنا دینے پر بھی متعجب ہیں۔حالانکہ چوڑیاں عورت کا زیور ہے۔ایسے سماج میں پروان چڑھنے والی بچی کس طرح بطور بیٹی، بہن اور ماں روشن دلیل ثابت ہو سکتی ہے۔وہ لکھتی ہیں۔:

"صنفی کمتری کے استعارے اور برتری ثابت کرنے کے لیے گھڑے گئے محاورے اور فقرے معاشرے کی ڈکشنری سے خارج کر کے اور تعلیمی اداروں کے نصاب کو بدل کر تو دیکھئے۔آپ ایک مختلف سماج پائیں گے۔"12؎

ضیا کے دور میں مذہب کے نفاذ میں ڈوپٹہ اوڑھنے کا حکم میڈیا پر آنے والی ہر خاتون کے لیے تھا۔اس کے ساتھ میک اپ نہ کرنے کا حکم بھی آیا۔جس کو مصنفہ سمیت متعدد ٹی وی اینکرز و نیوز کاسٹرز نے مسترد کرنے کے لیے اخبار میں احتجاج ریکارڈ کروایا۔خود نوشت نگار اس ضمن میں منٹو کا فقرہ"عورت کو سات پردوں میں چھپا دیجئے مگر مردوں کو حساب اپنی نگاہوں کا دینا ہو گا" کو پیش کرتی ہیں۔راقم الحروف کے خیال میں عورت کو بھی اپنے آپ کو بچانا ہے وہ بھی اپنے عمل کی ذمہ دار ہے۔مرد اساس معاشرے میں سماجی تحفظات صنف نازک کے لیے تادم مرگ ہی رہیں گے۔سن پچھتر میں پہلی عالمی کانفرنس میکسکو میں ہوئی۔اقوام متحدہ کے زیر اہتمام یہ کانفرنس خواتین کے اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا ثمر تھی۔خواتین کے خلاف امتیازی حقوق کا خاتمہ اس کانفرنس کا مسودہ تھا۔ساری دنیا میں حقوق نسواں کی پاسداری کی تحریک تھی مگر پاکستان میں خواتین کے حقوق کی سلبی کی منصوبہ سازی کی جا رہی تھی اس منصوبہ سازی کی تکمیل میں حدود آرڈیننس سامنے ایا۔کشور ناہید اس حوالے سے لکھتی ہیں۔:

"خیر سے بھٹو صاحب کی پھانسی اور عورتوں کے بارے میں حدور آرڈیننس آگے پیچھے ائے۔پتہ چلا کہ جیلیں عورتوں سے بھر گئیں کہ کسی نے اپنی ماں کو، کیسی نے اپنی بیوی کو اور کسی نے بہن کو زنا کے نام پر اندر کرایا۔"13؎

حدود آرڈیننس سے بظاہر مستفید ھونے والی غالب اکثریت جنس مخالف کی اور متاثر صنف نازک تھی۔حدود آرڈیننس کے مطابق متاثرہ عورت کو زناکاری کو ثابت کرنے کے لیے چار مسلمان مردوں کی گواہی پیش کرنا لازم قرار دیا گیا۔اس حدود آرڈیننس کی پہلی متاثر نابینا لڑکی تھی جو مالک کے بیٹے کے زنا بالجبر سے حاملہ ہوئی اور شرعی عدالت نے اسے بیس کوڑوں کے ساتھ سولہ سال قید کی سزا سنائی.خود نوشت نگار شریعت کے اس عمل پر نوحہ کناں ہیں۔ "کیا انسانیت کی اس سے زیادہ بھی کوئی تذلیل ہو سکتی تھی۔شریعت کے ٹھیکدار ایک کمزور لڑکی کو کوڑے لگا کر اپنے مذہب کے بارے میں کیا ثابت کر رہے تھے کہ یہ ایک اتنا بے انصاف مذہب ہے۔"14؎

ایسے ہی مرد اساس معاشرے میں سماجی عناصر کی وجہ سے مخلوط ماحول میں صنف نازک کے کام کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔وہ جنرل ضیا کے قریبی ساتھی اور میڈیا کے اعلیٰ اہل کار کی سوچ کی ترجمانی کرتی ہیں جو میڈیا کی خواتین کو تقریبا اپنی ملکیت تصور کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً کچھ کہنے میں سرگرداں رہتے تھے۔ماہ پارہ اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں میڈیا کے ماحول کو پرکھتی ہیں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ جنسی ہراسگی کا سامنا

GUMAN
گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

ریڈیو، ٹی وی اور پروگرام کے شعبے میں خواتین کارکن کو بھی تھا۔ ماہ پارہ نے ٹی وی کا شام کا بلیٹین پڑھنا شروع کیا تو ایک سینئر ایڈیٹر پریشانی کا سبب بننے لگے۔ ترقی کی ازلی خواہش موصوف کی خوشی سے منسلک ٹھہری۔ ماہ پارہ لکھتی ہیں۔:

"ان کے آفس سیکریٹری بڑے اطمینان سے ان کا پیغام مجھے پہنچاتے تھے کہ صاحب گھر ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ جب میں نے وجہ پوچھتی تھی کیوں بلا رہے ہیں؟ تو بہت معنی خیز انداز میں جواب دیتے تھے کہ یہ اپ ان سے پوچھ لیجئے۔"15؎

مرد اساس سماج صنف نازک کو ہمسری دینے کا خواہاں نہیں ہے۔ صنف نازک کو مرد سے کم یا بالا قرار دینا دونوں صنفوں کے لیے مثبت نہ ہے۔ جنرل ضیاالحق کی موت کی خبر بوجہ خاتون نیوز اینکر خود نوشت نگار کو پڑھنے نہ دی گئی۔ خود نوشت نگار اس صنفی امتیاز پر کڑھتی رہ گئی. صفدر ہمدانی کی پیشہ ورانہ ترقی کو مصنفہ کی سفارش کے مرہون منت قرار دیا۔ حتی کہ مصنفہ کی بی بی سی میں منتخب ہونے کے عمل کو بھی سفارشی عمل کا نتیجہ سمجھا گیا۔ صنف نازک کے لیے سفارشی عمل جنسی تعلق کے مترادف قرار دیا جانا سماج کی قبیح سوچ کی عکاسی ہے۔ ماہ پارہ کو ملک چھوڑنے کی اجازت نہ ملی اور کسی وزیر سے انکے مراسم کو بنیاد بنا کر ان پر اعتراض لگ گیا. وہ کسی بھی خاتون کی ترقی کو محض مراسم و تعلقات سے تعبیر کرنے کی ذہنی پسماندگی پر افسوس کرتی ہیں۔ اپنے وطن واپس نہ جانے کی ایک وجہ یہی ذہنی پسماندگی اور محبوس رویے ہیں جو ایک سیکنڈ میں کسی بھی خاتون کے کردار کو مشکوک قرار دے دیتے ہیں۔ وہ اس کرب کے بارے میں لکھتی ہیں:-

"اسے گزرے لگ بھگ تیس برس ہو چکے ہیں مگر یہ ذہنی کوفت یہ کسک آج بھی ذہن سے محو نہیں ہوئی۔"16؎

صنفی امتیازات صرف پاکستان تک محدود نہیں ہیں۔ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی صنفی امتیازات رواں ہیں بس منظر عام پر لائے نہیں جاتے ۔بی بی سی میں بھی عورتوں کو جزباتی اور پروفیشنلی کم تر سمجھا جاتا ہے۔ ماہ پارہ بی بی سی انگلش کی انچارج شعبہ حالات حاضرہ میری رین سے گفتگو کا احوال بیان کرتی ہیں۔ میری رین فٹ بال کی خبریں بنانے کی بے حد شوقین تھی۔ ایڈیٹر میری رین کی فٹ بال یا کسی سنجیدہ مضامین پر بنائی ہوئی خبر پڑھ کر پھاڑ دیتے اور انھیں خواتین کے نسوانی موضوعات پر مضامین لکھنے کیا کہتے۔ بی بی سی کے صنفی امتیاز کی حد تو یہ تھی کہ خواتین کی تنخواہ اور ترقی کے مواقع مرد ملازموں سے کم تھے۔ حتی کہ کوئی بھی خاتون صاحب اختیار عہدہ پر براجمان نہ تھی۔ پاکستان کی سرکاری پالیسی میں صنفی امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے ماہ پارہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ جہاں خواتین اور مردوں کی تنخواہ کے ساتھ ترقیاتی مواقع بھی یکساں ہیں۔ ملازمت پیشہ خواتین کا بطور ماں بچوں کی پرورش و پرداخت میں صنفی امتیازات کو سہتی ہیں کہ ان کے بہت سے ترقی کے مواقع اس ضمن میں ضائع ہو جاتے ہیں. ایک تحقیق کے مطابق پیشہ وارانہ زندگی میں درپیش دقتیں اور امتیازات کی وجہ سے بیس فیصد لڑکیاں ماں بننا پسند نہیں کرتی ہیں۔ یورپی ممالک میں لڑکیاں صرف ماں نہیں بلکہ ایک انسان کے طور پر اپنی شخصیت کی تکمیل کا مطالبہ کرتی ہیں۔ خود نوشت نگار اقوام متحدہ کے ادارے برائے شیلٹر کی افسر صفیہ بانو سے ملی جنھوں نے خواتین کے سماجی مسائل میں اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا کہ خیمہ نشین خواتین کو امداد خاندان کے کسی بھی مرد کے نام پر دی جاتی ہے بھلے خواتین بیوہ ہوں یا ان کے خاندان کا کوئی بھی مرد زندہ نہ ہو۔ سماج خاتون کو ایک عورت کی حثیت سے تسلیم نہیں کرتا ہے بلکہ اسکی پہچان مرد رشتوں سے نسبت ہی ہے۔ ان علاقوں میں اکیسویں سدی میں خاتون اپنے تشخص و حقوق کے لیے سرگرداں ہے. شاہ کاشف رحمان لکھتے ہیں۔:

"مغرب ہمارے عمومی معاشرے میں ننگی پنڈلیوں اور آوارہ گردیوں کا دوسرا نام ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مغرب میں عورت کس قدر کام کرتی ہے کس طرح مرد کے مارنے پر جا کر اگلے دن اس پر مقدمہ کر سکتی ہے اور کس طرح تعلیم و تربیت کا مساوی حق رکھتی ہے۔"17؎

اکیسویں صدی کو میڈیا کی صدی کہنا بے جا نہ ہو گا مگر یہ صدی خواتین کے لیے 'ایجزم' کو بانہوں میں پھیلائی کھڑی ہے۔ صنفی امتیازات اب عمر رفتاں پر آ کر ٹھہرے ہیں۔ ماہ پارہ ٹی وی اسکرین یا جر نلزم میں خواتین کے ساتھ عمر کی بنیاد پر امتیازی سلوک پر نالاں ہیں. عورتوں کا بڑھتی عمر میں سماج کا دخیل زیادہ ہے۔ بچپن سے پچپن تک بڑھتی عمر انہیں انکی اہمیت و وقعت میں کمی کا احساس دلاتی ہے اور یہ احساس معاشرے کی دین ہے۔ جہاں لڑکی کی شادی کو عمر کی خاص حد سے مشروط کر دیا جاتا ہے۔ عمر پرستی میں مرد و عورت کی عمر کی تخصیص میں پیشہ وارانہ صلاحتیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ عمر کا بڑھنا کسی بھی باصلاحیت پیشہ ور خاتون کے لیے نااہلیت ثابت ہوتا ہے۔ وہ جنس کی اس تخصیص کو ناانصافی قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"خاتون چاہے جتنی بھی پروفیشنل ہو مگر عمر بڑھ جائے تو وہ ٹی وی سکرین کے لیے اینکر منتخب نہیں ہو پاتی۔ اس کی صلاحیت، قابلیت اور ان کا تجربہ سب پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ پروفیشنل خاتون نہیں رہتی ہے.18؎

حوالہ جات

شبنم شکیل، خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، (اسلام اباد: وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان، ۲۰۰۵) ص ۳۱

خالدہ حسین، زہر انگار، شعر و حکمت، کتاب ۱۲، دور: سوم، ص ۱۰۳

ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، (جہلم: جہلم بک کارنر، دسمبر ۲۰۲۲ء) ص ۳۲

محولہ بالا، ص ۸۳

محولہ بالا، ص ۳۷

محولہ بالا، ص ۳۳۰

محولہ بالا، ص ۲۹

محولہ بالا، ص ۳۴۳

محولہ بالا، ص ۳۰۶

محولہ بالا، ص ۱۸۴

کشور ناہید، شنائیاں ور سوائیاں، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸) ص ۱۸۴

ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، ص ۳۹

کشور ناہید، شنائیاں ور سوائیاں، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸) ص ۱۷۸

ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، ص ۱۸۲

محولہ بالا، ص ۲۰۹

محولہ بالا، ص ۲۳۲

شاہ کاشف رحمان، مضمون کشور ناہید کا صنفی شعور بحوالہ خواب اور خاک کے درمیان مشمولہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ص ۱۳۷

ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، ص ۲۶۲